© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

آئینی ترامیم: جمہوری قبا میں مستقل مارشل لا کا منصوبہ

پروفیسر خورشید احمد

جنرل پرویز مشرف کی آئینی ترامیم کی بلّی دو سال سے قومی ادارہ تعمیرنو (این بی آر) کے تھیلے میں اُچھل کود مچائے ہوئے تھی' اور اس پورے عرصے میں اخبارات میں رونما ہونے والی جھلکیوں (leaks) اور ارباب حکومت کے ارشادات کے ذریعے تانک جھانک کا ہنگامہ برپا رکھنے کے بعد اب' ۲۶ جون ۲۰۰۲ء کو بالآخر تھیلے سے باہر آ گئی ہے لیکن جو منظر سامنے آیا ہے وہ کم سے کم الفاظ میں یہ ہے کہ تھیلے سے نکلنے والی چیز نہ بلّی ہے اور نہ بلا' بلکہ ایک ایسی بَلا ہے جسے اگر قابو نہ کیا گیا تو وہ جمہوری قبا میں ''دیو استبداد'' کا روپ دھار سکتی ہے۔ خطرہ اب آنکھوں کے سامنے ہے اور قوم کے لیے اس کا مقابلہ کرنے اور مقابلے کی تیاری کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

ہم نے ان ترامیم کو جنرل پرویز صاحب کی تجاویز کہا ہے اور محض جنرل تنویر یا دوسرے مشیروں کی اختراع قرار نہیں دیا خواہ ان کو اظہار کا ذریعہ بنایا گیا ہو۔ جنرل صاحب نے خود بھی ان کے دفاع کا اہتمام کیا ہے اور گذشتہ دو سال میں وہ وقتاً فوقتاً جن خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں' یہ اب ان کی ایک مربوط اور منظّم شکل ہے۔ انھیں ان تجاویز کی ذمہ داری کھل کر قبول کرنی چاہیے اور قوم کو بھی سمجھنا چاہیے کہ جنرل صاحب کا ذہن اور منصوبہ کیا ہے؟ نیز ان کے اقتدار میں رہنے اور اقتدار کے رنگ و آہنگ کے عزائم کے بارے میں کسی شک و شبہے میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ این بی آر کے دانش ور اور جنرل صاحب کے وزرائے کرام جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ جنرل صاحب ہی کی آواز بازگشت ہے۔ ان سب کا حال صرف یہ ہے کہ

انھی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں' زبان میری ہے بات ان کی

پوری تجویز کا جو ایک قابلِ قدر پہلو ہے وہ اس پر بحث و گفتگو کا تھوڑا سا موقع ہے جو لولا لنگڑا ہونے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے باوجود بساغنیمت ہے۔ الیکٹرانک میڈیا پر حکومت اور اس کے ہم خیالوں کا اجارہ ہے' عوامی رائے کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جارہا ہے اور مخالف رائے کے اظہار کے لیے مساوی تو کیا مناسب مواقع بھی حاصل نہیں۔ لیکن سرکاری اہتمام میں ابلاغیاتی شعبدہ بازیوں کے باوجود بحث و مذاکرے کا جو موقع میسر ہے' وہ تاریک افق پر روشنی کی ایک کرن ہے۔ اس ننھی سی کرن میں عوامی ردعمل اور سیاسی بصیرت رکھنے والوں کے اضطراب کو دیکھا جاسکتا ہے۔

اب یہ بات مسلمہ ہے کہ تمام اہم سیاسی جماعتوں اور ہر مکتب خیال کے قائدین نے ان تجاویز کی مخالفت کی ہے۔ ۹۰ فی صد اخباری تبصرے (اداریے' مضامین اور کالم) ان کے خلاف ہیں اور جن حضرات نے جزوی تائید کی ہے ان کا رویہ بھی معذرت خواہانہ اور خفت بھرا ہے۔ نیز تمام ہی بار کونسلوں نے شدید تنقید کی ہے۔ قومی ردعمل کے جائزے سے جو تصویر سامنے آئی ہے' وہ ان تجاویز سے مکمل بے زاری اور عدم اتفاق کی ہے۔ بلاشبہہ وہ چند مثبت یا قابل غور تجاویز کی نشان دہی کے ساتھ تمام ہی حلقوں نے ترامیم کے اصل اہداف اور جوہری تبدیلیوں کو قطعاً ناقابل قبول قرار دیا ہے۔ یہ قوم کے اصل جذبات اور احساسات کا آئینہ ہے لیکن حکومت کا رویہ منفی اور بے اعتنائی کے ساتھ ساتھ ضد اور ہٹ دھرمی کا مظہر ہے جو ملک اور قوم کے مستقبل کے لیے اپنے اندر بڑے مہیب خطرات رکھتا ہے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بالکل غیر جذباتی انداز میں اصل مسائل پر دلیل کی زبان میں گفتگو کی جائے تاکہ جنرل پرویز مشرف اور ان کے ساتھیوں کے باب میں اتمام حجت ہو سکے اور پوری قوم اصل حقائق' مجوزہ ترامیم کے مضمرات اور متعلقہ دستوری' قانونی' سیاسی اور اخلاقی پہلوؤں کے بارے میں کسی لاگ لپٹ کے بغیر آگاہ ہو جائے۔ آیندہ کے معرکے کامیابی سے سر کیے جاسکیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ حق بالآخر کامیاب ہوگا اور ان شاء اللہ دلیل کی قوت ذاتی عزائم' گروہی مفادات اور بودے سہاروں کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جائے گی--- جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا۔

حکومت کی طرف سے "مستحکم وفاقی جمہوریت" (sustainable federal democracy) کے قیام کے لیے ۵۸ صفحے کی دستاویز شائع ہوئی ہے۔ اس میں دستور کی ۲۸ دفعات میں ۳۷ ترامیم کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ اس کے لیے کچھ دلائل اور جواز (rationale) فراہم کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ ہم نے اس کا دقت نظر سے مطالعہ کیا ہے اور ان تجاویز کے حق میں جنرل پرویز اور ان کے رفقاے کار نے جو کچھ کہا ہے اس پر کھلے دل سے غور کیا ہے۔ ان تجاویز پر جو نقد و تبصرہ گذشتہ تین ہفتوں میں آیا ہے اس پر بھی کسی تعصب کے بغیر غور و فکر کیا ہے۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پاکستان کی تاریخ میں نظام حکومت کی تبدیلی کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بارے میں آج تک جو بھی تجاویز اور منصوبے آئے ہیں' یہ تجاویز سب سے زیادہ خطرناک اور دور رس نتائج کی حامل ہیں۔ یہ تجاویز جنرل ایوب اور جنرل ضیاء الحق کے دستوری تصرفات سے بھی زیادہ خطرناک' غیر متوازن' غیر حقیقی اور صرف شخصی حاکمیت اور سیاست میں فوج کو اس طرح پھنسا دینے کا ذریعہ ہیں جو ملک اور فوج دونوں کے لیے تباہ کن ہو سکتی ہیں۔ اس لیے ان کا دقت نظر سے تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ جزوی طور پر ان میں سے چند تجاویز اور مسائل کے تجزیے کے سلسلے میں چند امور ایسے بھی ہیں جن پر صحیح فورم میں غور ہو سکتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی یہ ترامیم' دستور کا حلیہ بگاڑنے' اور ملک کے سیاسی نظام کو ایک ایسا ملغوبہ بنانے پر منتج ہوں گی جو نہ جمہوری ہوگا' نہ فیڈرل اور نہ کسی دیرپا نظام کا ضامن ہو سکے گا۔ عنوان میں جو تین اہداف رکھے گئے ہیں: دیرپا' وفاقی اور جمہوری' یہ تجاویز ان تینوں کی نفی کرتی ہیں اور 'برعکس نہند نام زنگی کافور' کے مثل ہیں۔ ضرورت ہے کہ ایک ایک تجویز پر مفصل گفتگو کی جائے مگر وقت اور جگہ کی قلت اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اس لیے ہم صرف چھ مرکزی اہمیت کے پہلوؤں پر گفتگو کریں گے اور پھر حکومت اور قوم کو دعوت غور و فکر دیں گے کہ قوم اور ملک کے مفاد میں اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جائے۔

ترمیم کا اختیار

سب سے پہلا اور اہم ترین سوال یہ ہے کہ کیا جنرل پرویز مشرف کو دستور میں اس طرح ترمیم کرنے کا کوئی اختیار حاصل ہے؟ جو بھی اقدام کسی قانونی اور اخلاقی استحقاق (legal and moral authority) کے بغیر کیا جائے گا' وہ کبھی مقبول اور معتبر نہیں ہو سکتا۔ قانونی جواز ہی عوامی قبولیت اور دیرپا استحکام کی بنیاد بنتا ہے اور جو نظام قانونی اور اخلاقی جواز سے محروم ہو وہ تار عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ثابت ہوتا ہے۔

جنرل مشرف اور بی این آر نے جنرل صاحب کے اختیارات برائے ترمیم دستور کی بنیاد سپریم کورٹ کے ۱۲ مئی ۲۰۰۰ء کے فیصلے پر رکھی ہے اس لیے سب سے پہلے اس مسئلے پر بات کرنے کی ضرورت ہے۔

دستور ایک ملک کے بنیادی قانون (fundamental law) کا درجہ رکھتا ہے اور ۱۹۷۳ء کے دستور کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ قومی اتفاق رائے (national consensus) کی بنیاد پر بنایا گیا ہے۔ بلاشبہہ وہ ایک انسانی دستاویز ہے اور اس میں تبدیلی ممکن ہے بلکہ کبھی ضروری بھی ہو سکتی ہے لیکن اس کے لیے وہی طریقہ قابل قبول ہو سکتا ہے جو خود دستور میں طے کیا گیا ہے۔ اس سے ہٹ کر کوئی طریقہ معتبر نہیں ہو سکتا۔

یہ بات قابل یاددہانی ہے کہ اس دستور میں خود بھٹو کے دور میں سات ترامیم کی گئیں جن میں سے صرف ایک ترمیم (یعنی قادیانیت کے بارے میں) پر اتفاق رائے تھا اور صرف وہی ترمیم معتبر رہی۔ باقی ترامیم بھٹو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صاحب کے دور کے ساتھ ہی ختم ہو گئیں۔ جنرل ضیا الحق کی ترامیم کا معاملہ بھی اس سے زیادہ مختلف نہیں۔ ان پر قومی اتفاق رائے نہیں تھا لیکن انھوں نے ۱۹۸۵ء کی مجلس شوریٰ سے اپنی ترامیم کو متفقہ طور پر منظور کرانے کے لیے ان میں ایک درجن کے قریب اہم ترامیم کیں اور اس طرح ایک نام نہاد اتفاق رائے (pseudo consensus) پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۷۳ء کے دستور کی تین بنیادیں ہیں: اسلام، وفاقی نظام اور پارلیمانی جمہوریت جو پارلیمنٹ کی بالادستی، عدلیہ کی آزادی، بنیادی حقوق کی ضمانت اور انتظامیہ کی پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہی سے عبارت ہے۔ دستور نے ترمیم کا بھی ایک واضح طریق کار طے کر دیا ہے۔ دستور میں ترمیم نہ صدر کر سکتا ہے اور نہ سپریم کورٹ۔ اسی طرح چیف آف اسٹاف جس دستور کی تخلیق ہے، اس میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ ترمیم دستور تو اتنا نازک معاملہ ہے کہ محض ایک ایوان پارلیمنٹ بھی یہ کام نہیں کر سکتا۔ دستور نے ترمیم کا جو طریقہ رکھا ہے وہ یہ ہے کہ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی دو تہائی اکثریت کی رضامندی سے ترمیم ہو سکتی ہے۔ گویا اگر ایک ایوان بھی اتفاق نہ کرے تو ترمیم ممکن نہیں۔ اس کے لیے مشترک اجلاس کی گنجایش نہیں رکھی گئی ہے۔ اس پس منظر میں یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ سپریم کورٹ کے مئی ۲۰۰۰ء کے فیصلے کی حقیقت کیا ہے اور اس کا جائز اور قانونی منشا کیا ہو سکتا ہے۔

اصل فیصلے پر غور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ چند دوسرے حقائق بھی سامنے رہیں۔ نصرت بھٹو کے کیس میں سپریم کورٹ نے جنرل ضیاء الحق کو ترمیم دستور کا اختیار دے دیا تھا مگر جنرل صاحب نے جب عبوری دستور کا حکم نامہ (پی سی او) نافذ کیا تو اس وقت کے چیف جسٹس انوار الحق صاحب نے جو اصل فیصلے کے مصنف تھے، اسے نصرت بھٹو کیس میں دیے ہوئے اختیار سے تجاوز اور عدالت کے فیصلے سے انحراف قرار دیا اور استعفیٰ دے دیا۔ اس سے سبق لیتے ہوئے سپریم کورٹ نے مئی ۲۰۰۰ء کے فیصلے میں محدود اور مشروط اختیار کا راستہ اختیار کیا جس کے نتیجے میں آج کی صورت حال اس سے یکسر مختلف ہے جس کا سہارا ماضی میں لیا گیا۔

دوسری بات یہ بھی سامنے رہے کہ دستور میں ترمیم کے مسئلے پر بھارت اور پاکستان کی سپریم کورٹ نے دو بڑے اہم فیصلے دیے ہیں۔ بھارت میں اندرا گاندھی نے ایمرجنسی نافذ کی تو سپریم کورٹ نے طے کیا کہ پارلیمنٹ بھی دستور میں من مانی ترمیم نہیں کر سکتی۔ تدوین دستور اور ترمیم دستور دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ تدوین دستور صرف دستور ساز اسمبلی ہی کر سکتی ہے جسے عوام نے دستور سازی کا اختیار دیا ہو۔ دستور کے تحت قائم ہونے والی پارلیمنٹ دستور کے بنیادی ڈھانچے میں تبدیلی نہیں کر سکتی۔ البتہ اس ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے اسے ترمیم کا اختیار ہے اور یہی ترمیم کا مفہوم ہے۔ گویا لفظ "ترمیم" کی محکم تعبیر کر دی گئی۔ یہ بڑا بنیادی فیصلہ تھا۔ اسی طرح کا فیصلہ پاکستان کی سپریم کورٹ نے اچکزئی کیس میں کیا اور یہ اصول طے کر دیا کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دستور کے بنیادی ڈھانچے میں ترمیم کا اختیار خود اسمبلی کو بھی نہیں۔ چہ جائیکہ کوئی فردِ واحد یہ کام کرنے کا مجاز ہو۔ سپریم کورٹ خود بھی دستور میں ترمیم نہیں کرسکتی۔ وہ صرف دستور میں ترمیم یا قانون کا عدالتی جائزہ (judical review) لے سکتی ہے۔ اس کا دائرہ تعبیر دستور ہے' ترمیم دستور نہیں۔ اس پس منظر میں' سپریم کورٹ بھی یہ اختیار نہیں رکھتی کہ کسی کو دستور میں کسی بنیادی تبدیلی کا حق دے سکے۔

اس پس منظر میں سمجھا جاسکتا ہے کہ ۱۲ مئی کے فیصلے میں سپریم کورٹ نے کیا کہا:

ہرگاہ کہ جنرل پرویز مشرف نے ایک ماورائے دستور اقدام کے ذریعے ریاست کے مفاد میں اور عوام کی بھلائی کے لیے جائز طور پر اقتدار سنبھال لیا ہے' انھیں حق ہے کہ ایسے سب اقدامات کریں اور ایسے قانونی راستے اختیار کریں جن کا آگے بیان کیا جا رہا ہے' یعنی:

۱- ایسے سب اقدامات یا قانونی راستے جو ۱۹۷۳ء کے دستور کے مطابق ہیں یا اس کے تحت کیے جاسکتے تھے بشمول اس میں ترمیم کے اختیار کے۔

۲- ایسے تمام اقدامات جو چیف ایگزیکٹو کے اعلان کردہ مقاصد کو حاصل کریں یا ان کے حصول میں مدد دیں۔

اس کے ساتھ عدالت نے واضح کر دیا کہ:

یہ کہ چیف ایگزیکٹو کی جانب سے دستوری ترامیم صرف اس صورت میں کی جاسکتی ہیں کہ دستور ان کے اعلان کردہ مقاصد کے حصول کے لیے کوئی حل فراہم کرنے سے قاصر ہو۔

یہ کہ دستور کی بنیادی خصوصیات میں کوئی ترمیم نہ کی جائے گی' یعنی عدلیہ کی آزادی' وفاقیت' پارلیمانی طرز حکومت بشمول اسلامی دفعات۔

اس فیصلے کی جو تعبیر دستور اور دستور کے متعلق عدالتی فیصلوں کی روشنی میں کی جاسکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ سپریم کورٹ نے چیف ایگزیکٹو کو اپنے اعلان کردہ پروگرام پر عمل کرنے کے لیے ۳ سال کی مدت دی اور ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۲ء سے پہلے نئے انتخابات منعقد کرنے کو ضروری قرار دیا۔

• واضح رہے کہ چیف ایگزیکٹو کے جس ۷ نکاتی ایجنڈے پر عمل کے لیے ۳ سال کی مدت اور قانون سازی کا اختیار عدالت نے دیا وہ ان نکات پر مشتمل تھا:

۱- قومی اعتماد کی بحالی' ۲- بین الصوبائی تفاوت دُور کر کے قومی یک جہتی کی بحالی' ۳- معیشت کا احیا' ۴- امن عامہ کو یقینی بنانا اور فوری انصاف کی فراہمی' ۵- سرکاری اداروں سے سیاست کو خارج کرنا' ۶- اختیارات کی نچلی سطح تک منتقلی' ۷- احتساب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگر عدالت کے فیصلے اور جنرل صاحب کے ایجنڈے کا معروضی تجزیہ کیا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ عدالت نے قانون سازی بشمول دستوری ترمیم کا اختیار ان ۳ سال کے اندر اس سات نکاتی پروگرام پر عمل درآمد کے لیے دیا تھا' مستقبل کے لیے کسی نئے دستوری ڈھانچے کی تعمیر کے لیے نہیں۔ ان ساتوں نکات کا کیا حشر ہوا؟ اسے اس وقت نظرانداز کر دیجیے (ان کے بارے میں دیکھیے: اشارات' جون ۲۰۰۲ء) اور صرف اس مسئلے پر غور کیجیے کہ ان میں سے کس کا تعلق صدر کے اختیارات' وزیراعظم کی تقرری اور معزولی' اسمبلی کی تحلیل' گورنروں کے تقرر اور قومی سلامتی کونسل کی تشکیل سے ہے۔ یہ مسائل عدالت کے زیرغور نہیں تھے۔ زیرغور صرف وہ سات نکات تھے جن پر جنرل پرویز مشرف اقتدار سنبھالنے کے بعد کچھ کر کے دکھانا چاہتے تھے' سپریم کورٹ نے قرار دیا کہ اس ایجنڈے پر کام کرنے کے لیے ان کو جن اقدامات یا قانون سازی کی ضرورت ہے وہ اسے انجام دے سکتے ہیں۔ عدالت نے لازم کیا کہ اس عمل میں ان کو ہر قدم دستور کے دائرے میں اٹھانا چاہیے اور دستور میں جو طریق کار دیا گیا ہے' اس کا مکمل احترام کرنا چاہیے۔ البتہ اگر کہیں رفعِ حرج (removal of difficulty) کے لیے' جو ایک معروف قانونی تصور (legal concept) ہے' کوئی ترمیم دستور میں کرنی پڑے تو کی جاسکتی ہے۔ اس کا دورانیہ بھی یہ تین سال تھے۔ اس دورانیے کے بعد کا نظام کورٹ کے فیصلے کے دائرے سے قطعاً باہر ہے۔

اپنے اس تین سالہ دور میں انھوں نے صحیح یا غلط کئی دستوری اقدام کیے جن میں صدارت کا مسئلہ بھی تھا (جو خود انھوں نے غیرفطری اور غیرضروری طور پر پیدا کیا)۔ سپریم کورٹ کے ترمیم دستور کے اختیار کا تعلق اگر ہوسکتا ہے تو صرف ان مسائل اور اِس دور سے ہے' اس کے سوا کچھ نہیں۔ اس میں ہرگز یہ اختیار نہیں کہ وہ آیندہ کا نیا سیاسی نظام ملک کو دیں- یہ نہ ان کے اصل ایجنڈے کا حصہ ہے' نہ سپریم کورٹ کے فیصلے میں اس دائرہ کار کا کوئی ذکر ہے' اور نہ کسی بھی دلیل کے ذریعے اسے ان کی ذمہ داری قرار دیا جا سکتا ہے- جو ترامیم وہ اب لا رہے ہیں ان کا کوئی تعلق اس ایجنڈے سے نہیں۔ بلکہ واضح طور پر وہ ان تمام حدود اور پابندیوں کو پامال کرنے کا باعث ہوں گی جو سپریم کورٹ نے صاف لفظوں میں عائد کی تھیں--- یعنی پارلیمانی نظام اور وفاقیت اصول کی خفاظت- دستوری ترامیم کی جو تجاویز اس وقت پیش کی جا رہی ہیں ان کے لیے سپریم کورٹ کی محدود اور مقید اجازت کا سہارا ایک ایسی جسارت ہے جسے شیطان کے آیتیں پڑھنے (devil quoting scripture) کی بدترین مثال ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

دستور میں ترمیم دستور کے دیے ہوئے طریق کار کے مطابق ہی ہوسکتی ہے۔ جنرل صاحب کے لیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک ہی معقول راستہ ہے اور وہ یہ کہ الیکشن کے بعد دستوری ترمیم کے مسئلے کو پارلیمنٹ میں زیر بحث لانے کی دعوت دیں اور پارلیمنٹ کے دونوں ایوان ان پر کھلی بحث کے ذریعے میرٹ کی بنیاد پر غور کریں۔ کسی فرد واحد کو یہ اختیار نہیں کہ دستور کی من مانے انداز میں بیخ کنی کرے یا قوم کے متفقہ دستور پر اپنے زعم میں جو نیا ڈھانچہ چاہے مسلط کر کے اس کا حلیہ بگاڑ دے۔ افسوس کہ جنرل پرویز نے اپنے پیش رو فوجی حکمرانوں اور طالع آزماؤں کی اسی نوعیت کی کوششوں اور ان کے انجام سے بھی کوئی سبق نہ سیکھا۔ جنرل ایوب نے ایک فرد واحد کی حیثیت سے ۱۹۶۲ء کا دستور بنایا اور وہ دستور ان کے اقتدار کے سورج کے غروب ہونے کے ساتھ ہی لقمہ اجل بن گیا بلکہ ان کے اپنے ہاتھوں اس کا جھٹکا ہوا۔ جب انھوں نے اس دستور کے تحت اقتدار اسمبلی کے اسپیکر کی طرف منتقل کرنے کے بجائے اس وقت کے فوج کے سربراہ جنرل یحییٰ کو منتقل کیا۔ جنرل یحییٰ نے جو دستور بنایا' وہ ان کے رخصت ہونے کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ جنرل ضیاء الحق کو اسمبلی اور سینیٹ سے سمجھوتہ کر کے اپنی ترمیمات منوانا پڑیں اور پھر بھی ان کو وہ تقدس اور احترام حاصل نہ ہو سکا جو دستور کا حق ہے۔ جنرل پرویز بھی اسی ناکام راستے پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ایک ''کمانڈو صدر'' کا کردار ادا کرنے کی جسارت کر رہے ہیں لیکن اس کا انجام بھی دوسروں سے مختلف نہیں ہو سکتا۔

اخلاقی حیثیت

دوسرا بنیادی مسئلہ جنرل صاحب کی ذات اور اخلاقی استحقاق کا ہے۔ انھیں اپنی حیثیت کو نہیں بھولنا چاہیے۔ وہ لاکھ لوگوں کو یقین دلائیں کہ وہ ''اب بھی ۱۹۹۹ء والے جنرل مشرف ہی ہیں'' لیکن ان تین برسوں میں ان کی شخصیت بری طرح مجروح ہوئی ہے۔ اب قوم ان کو ان کے تین سالہ ریکارڈ کی روشنی میں دیکھ رہی ہے۔ ان کے سات نکات میں سے ایک بھی مثبت نتائج کا حامل نہیں ہو سکا۔ قومی وقار بلکہ ملک کی آزادی اور خودمختاری کی جو پامالی اس دور میں ہوئی ہے وہ شرم ناک ہے۔ جس طرح ہم امریکہ کے عالمی استعماری عزائم کا آلہ کار بنے ہیں اور جس طرح امریکہ نے ہمیں استعمال کیا ہے اور بھارت کے ساتھ اسٹرے ٹیجک شراکت کا تانا بانا بُنا ہے اس نے ملک کو نئے اندرونی اور بیرونی خطرات سے دوچار کر دیا ہے۔ جو دوست تھے وہ دشمن بن گئے ہیں' جو مخالف تھے وہ سر چڑھ رہے ہیں اور جو نفرت امریکہ کا مقدر تھی اس کا ایک حصہ اب ہمارے حصے میں بھی آ گیا ہے۔ بلکہ اگر امریکی روزنامہ وال اسٹریٹ جرنل کے ایک تازہ جائزے پر یقین کیا جائے تو خود جنرل صاحب کی امریکہ کے لیے افادیت کی مدت اکتوبر ۲۰۰۲ء تک رہ گئی ہے۔ کینیڈا کے روزنامہ دی گلوب اینڈ میل میں پال ناکس نے تو دسمبر ۲۰۰۱ء (شمارہ ۱۰ دسمبر ۲۰۰۱ء) ہی میں پیشین گوئی کر دی تھی:

اب جب کہ جنگ کے آخری مراحل ہیں' جنرل مشرف سیاسی شطرنج کے کھیل کے اختتام پر نقصان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ہیں۔

اس نے مبصرین کی یہ رائے بھی نقل کی تھی کہ:

> ہم بین الاقوامی سطح پر بنیادی طور پر تعلقات کی نئی ترتیب تشکیل پانے کی تصویر دیکھ رہے ہیں۔ امریکہ، بھارت، اسرائیل اور روس کئی مسائل پر بظاہر قریب آتے نظر آ رہے ہیں لیکن پاکستان کو بے آسرا چھوڑ دیا گیا ہے۔

امریکی جریدے نیوز ویک (۱۵ جولائی ۲۰۰۲ء) نے پاکستان کے حالات کی جو منظرکشی کی ہے وہ جنرل صاحب کی تین سالہ کارکردگی کی عکاس ہے:

> بہت سے پاکستانی فوج میں اس لیے شامل ہوئے کہ اپنے ملک کا بھارت کے خلاف دفاع کریں گے۔ وہ اس کے لیے لڑنے اور جان دینے کے لیے تیار اور راضی ہیں۔ لیکن ان میں سے بہت سوں کے لیے مسئلہ یہ ہے کہ وہ غلط دشمن سے لڑ رہے ہیں۔ (ص ۱۸)

انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹربیون نے اپنی ۶ جولائی کی اشاعت میں نیویارک ٹائمز کا اداریہ دیا ہے جس میں ایک طرف اس بات کا اعتراف ہے کہ جنرل مشرف اب بھی نام نہاد ''تشدد کے خلاف جنگ'' میں امریکہ کی ضرورت ہیں۔ نیز اس لیے بھی امریکہ کے لیے مفید ہیں کہ وہ ''مغرب نواز اور سیکولر نظام حکمرانی کے علم بردار'' ہیں لیکن ساتھ ہی کشمیر کے سلسلے میں ان کے کردار کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اس زمینی صورت حال پر تشویش کا اظہار کیا ہے کہ ریفرنڈم کی حماقت کر کے انھوں نے اپنی پوزیشن کمزور کر لی ہے اور جمہوری اداروں کی تکیل بندی کے لیے جو دستوری ترامیم وہ لا رہے ہیں اس سے ان کی عوامی مقبولیت کو دھچکا لگے گا اور ملک میں ان سے مایوسی پیدا ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک اور ملک سے باہر جنرل پرویز مشرف کی پوزیشن روز بروز خراب ہو رہی ہے۔ آج کسی کی نظر میں بھی ان کی عزت نہیں ہے، اور پاکستان کے ساتھ بھی وقار اور عزت کا معاملہ نہیں کیا جا رہا جس کی تازہ ترین مثال وہ جھاڑ ہے جو امریکہ کے نائب وزیر خارجہ آرمی ٹیج نے سرحد پار دراندازی روکنے کے لیے وعدے مکمل طور پر پورے نہ کرنے پر جنرل صاحب اور ان کے نمایندوں کو پلائی ہے۔ آج بھارت کو تو اس کے ریاستی تشدد پر کوئی کچھ نہیں کہہ رہا اور سارا دباؤ پاکستان پر ہے کہ جہاد کشمیر کی ہر قسم کی اعانت سے دست کش ہو جائے۔ اس صورت حال کا موازنہ اگر ۱۰ سال پہلے کے حالات سے بھی کیا جائے تو فرق واضح ہو جاتا ہے۔ بھارت کے ایک سابق کیبنٹ سیکرٹری وی بالاچندرن نے ۱۰ جولائی ۲۰۰۲ء کے دی ایشین ایج میں اپنی جو یادداشتیں شائع کی ہیں وہ پڑھنے اور غور کرنے کے لائق ہیں۔ وہ ۱۴ دسمبر ۱۹۹۲ء کو واشنگٹن میں اس وقت کے سی آئی اے کے ڈائرکٹر رابرٹ گیٹس سے ان کے دفتر میں ملاقات میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پاکستان کے خلاف اسی سرحد پار دراندازی کے بارے میں اپنی شکایت کا ذکر کرتے ہیں اور روبرٹ گیٹس کے ردعمل کو بیان کرتے ہیں:

> ہمیں امید تھی کہ وہ پاکستان کی پشت پناہی سے ہونے والی دہشت گردی پر تشویش کا اظہار کریں گے اس لیے کہ وہ برعظیم میں ہونے والے واقعات سے قریب سے واقف رہے تھے۔ مگر ہم تعجب میں رہ گئے جب انھوں نے ہمارے لیڈروں کو ایک واعظانہ ڈانٹ پلائی: ''مسٹر سیکرٹری' ہم نے آپ کی باتوں کو نوٹ کیا ہے لیکن ہم پاکستان سے آپ کے خلاف ایسی ہی شکایتیں سن رہے ہیں اور ہم پسند کریں گے کہ ایسی شکایتیں آیندہ نہ سنیں''۔ (دی ایشین ایج' لندن' ۱۰ جولائی ۲۰۰۲ء)

یہ تھا امریکہ کا رویہ ۱۰ سال پہلے' اور آج جنرل صاحب کی امریکہ کی ساری ناز برداری کے باوجود کیا ہے ہماری عزت اور وقعت! ہوسکتا ہے کہ جنرل صاحب ۱۹۹۹ء اور ۲۰۰۰ء میں ایک ہی ہوں لیکن پاکستان کا حال تو ایک سا نہیں رہا۔

کسی بھی فرد واحد کو دستور میں ترمیم کا اختیار نہیں۔ قائداعظم کی تقلید کی باتیں تو ہم بہت کرتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ قائداعظم جن کی قیادت میں ملت اسلامیہ ہند نے پاکستان قائم کیا اور ان کو بے تاج ہی نہیں تاجدار ''بادشاہ'' کا مقام دیا' انھوں نے بھی ایک بار نہیں بار بار کہا کہ پاکستان کا دستور بنانے کا کسی فرد کو اختیار نہیں۔ یہ صرف دستور ساز اسمبلی کا استحقاق ہے اور وہی یہ کام انجام دے سکتی ہے۔ (ملاحظہ ہو' ان کی تقریر سبی دربار بلوچستان' ۱۴ فروری ۱۹۴۸ء۔ خطاب سول افسران سبی' ۱۴ فروری ۱۹۴۸ء۔ خطاب عوام ریاست ہاے متحدہ امریکہ' فروری ۱۹۴۸ء (Jinnah: Speeches and Statements, 1947-48 آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس' ص ۱۰۸-۱۱۲-۱۲۵)

سوال یہ ہے کہ جو اختیار قائداعظم نے اپنے لیے بھی صحیح نہ سمجھا' جنرل پرویز صاحب کس دستوری' قانونی' سیاسی اور اخلاقی بنیاد پر ہم سے یہ اختیار مانگ رہے ہیں اور صرف اختیار ہی نہیں مانگ رہے بلکہ دستور کی جامہ تراشی اس طرح کرنا چاہتے ہیں کہ وہ صرف ان کے قدوقامت کی تزئین کا سامان بن جائے۔

آئینی ترامیم کے بارے میں ہمارا پہلا اعتراض دستوری اور اصولی ہے لیکن اب اس بارے میں بھی کوئی اشتباہ باقی نہیں کہ جنرل پرویز صاحب جس راستے پر چل نکلے ہیں وہ ذاتی اقتدار کا استحکام اور فوج کے شانوں پر سوار ہو کر شخصی حاکمیت کا قیام کے سوا کچھ نہیں۔ پہلے وہ یہ دعوے کرتے تھے کہ ''میرا کوئی شخصی ایجنڈا نہیں''، لیکن ان ترامیم نے ثابت کر دیا ہے کہ ان کا ہدف اداروں کا استحکام نہیں بلکہ ایک فرد کے ہاتھوں میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اقتدار اور سیاسی قوت کو محصور کرنا اور اسے اصل اختیارات کا مرکز بنانا ہے خواہ اس سے دستور کی صورت کتنی ہی قبیح کیوں نہ ہو جائے اور ملک کیسے ہی خطرات سے دوچار ہو جائے۔ اس کے لیے عدالت اور فوج دونوں کو استعمال کیا جا رہا ہے اور انتظامیہ اور نئی سول حکومت کا جو نظام بنایا گیا ہے اسے بھی اس مقصد کے حصول کے لیے جھونک دیا گیا ہے۔

اس سلسلے کا آغاز صدارت پر شب خون مارنے سے ہوا۔ پھر ریفرنڈم کا ڈراما رچایا گیا اور اب آئینی ترامیم کے ذریعے ایک ایسا سیاسی نظام ملک پر مسلط کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جس سے ملک میں نہ معروف معنی میں پارلیمانی نظام باقی رہے گا اور نہ معروف تصور کے مطابق کوئی صدارتی نظام ہی وجود میں آسکے گا بلکہ ایک ایسا مخلوط نظام (hybrid system) ہمارا مقدر ہوگا جس کو غالباً militio presidentism کہا جائے تو نادرست نہ ہوگا۔ ان ترامیم کا لازمی تقاضا ہے کہ قوت کا سرچشمہ صدر کی ذات بن جائے اور اصرار ہے کہ وہ صدر چیف آف اسٹاف بھی ہوگا۔ اس صدر کو صرف اسمبلی توڑنے ہی کا مکمل اختیار حاصل نہیں ہوگا بلکہ وزیراعظم نامزد کرنے' صرف وزیراعظم یا اس کی کابینہ کو برطرف کرنے' وزیراعظم کی طرف سے اسمبلی کی تحلیل کے مشورے کو اسمبلی کو واپس بھیجنے کا اختیار بھی ہوگا۔ اسی طرح اسے تمام صوبوں کے گورنر مقرر کرنے کا اختیار ہوگا اور یہ گورنر صدر کی طرح چیف منسٹر بنانے اور ہٹانے اور صوبائی اسمبلی تحلیل کرنے کا اختیار رکھیں گے جو وہ صدر کے مشورے سے انجام دیں گے۔ اس صدر کو تمام اہم تقرریاں کرنے کا بھی کلی اختیار ہوگا یعنی چیف الیکشن کمیشن' چیئرمین پبلک سروس کمیشن' بری' بحری اور ہوائی افواج کے سربراہ' جوائنٹ چیف آف اسٹاف کا سربراہ' نیب کا سربراہ۔ صدر قومی سلامتی کونسل کا سربراہ بھی ہوگا اور اس میں فوج کے تمام سربراہ موجود ہوں گے۔

سیاسی جماعتوں کے لیے تو پابندی ہے کہ ان کے سربراہ اور نمایندے جماعت اور حکومت دونوں کے بیک وقت عہدہ دار نہیں ہو سکتے لیکن فوج کے سربراہ کے لیے کوئی پابندی نہیں کہ صدر ہوتے ہوئے وہ فوج کا سربراہ نہیں ہو سکتا۔ دستور کی خلاف ورزی پر وزیراعظم کو تو برطرف کیا جاسکتا ہے مگر دستور کی خلاف ورزی صدر اور چیف آف اسٹاف کے لیے معاف ہے۔ دستور کی یہ شق کہ کوئی حاضر سروس سرکاری ملازم اسمبلی کا رکن نہیں بن سکتا چیف آف اسٹاف کے لیے ساقط ہو جائے گی۔ توازن اور چیک اینڈ بیلنس کی بات ہوتی ہے لیکن یہ کیسا توازن ہے کہ صدر چیف آف اسٹاف بھی ہو اور تمام صواب دیدی اختیارات سے مسلح ہو۔ وہ ایک پلڑے میں ہے اور دوسرے میں منتخب پارلیمنٹ جو صدر ہی کے رحم و کرم پر ہے۔ اگر توازن اسی کا نام ہے تو پھر الفاظ و معنی میں ربط کی بات کرنا پاگل پن ہی ہو سکتا ہے۔ وزیراعظم کے لیے تو شرط ہے اور بجا طور پر ہے کہ اگر اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے خلاف مواخذے کی قرارداد آجائے تو وہ اسمبلی کو تحلیل کرنے کی سفارش نہیں کر سکتا لیکن صدر کے خلاف اگر مواخذے کی قرارداد آجائے تو وہ اس کے بعد بھی اسمبلی کو تحلیل کر سکتا ہے۔ اس کے لیے کوئی چیک نہیں ہے۔ یہ کیسا چیک اینڈ بیلنس ہے؟ کسی ایک فرد کو سیاسی نظام کا اس طرح محور بنا دینا دراصل ایک قسم کی بادشاہت قائم کرنے کی کوشش ہے جو تاریخ کے دھارے کو موڑنے کے مترادف ہے۔ امریکہ کی نارٹے ڈام یونی ورسٹی کا پروفیسر رابرٹ جوہانسن اپنے ایک مقالے Military Policies and the State System as Impediments to Democracy" میں بڑے پتے کی بات لکھتا ہے جسے جنرل صاحب اور ان کے ہم خیالوں کو بھی سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے:

> کسی فرد کو خواہ وہ کتنا ہی عقل مند، کتنا ہی نیک اور کتنا ہی مقبول کیوں نہ ہو، کبھی بھی اس کے ہاتھ میں ایسے فیصلے کرنے کا اختیار نہیں دیا جا سکتا جو انسانی تاریخ میں بے حد اہم اور ناقابل تلافی ہوں۔ اس طرح کے اختیارات کسی جمہوریت میں جائز نہیں سمجھے جا سکتے۔ (بحوالہ Prospects for Democracy، تدوین: ڈیوڈ ہیلڈ، اسٹینفورڈ یونی ورسٹی پریس، کیلی فورنیا، ۱۹۹۳ء، ص ۲۲۶)

ملک میں استحکام اداروں کی مضبوطی سے آتا ہے، محض افراد کو مرکز اقتدار بنانے سے نہیں۔ جو قانون اور ضابطہ اصول اور حق پر مبنی نہ ہو اور جسے محض افراد کی خواہشات کی مناسبت سے وضع کیا ہو، وہ ترقی کی راہ کی رکاوٹ تو بن سکتا ہے اس کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ جنرل صاحب نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ ملک وقوم کے مفاد سے متصادم ہے اور خود ان کے لیے بھی خیر کا باعث نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ فی الحقیقت اس ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو ہوش کے ناخن لیں، تاریخ سے سبق سیکھیں اور اداروں کی تباہی سے باز رہیں۔ جس سمت میں وہ چل پڑے ہیں وہ جمہوریت کی سمت نہیں۔ شخصی حکومت اور مطلق العنانیت کا راستہ ہے اور اسے یہ قوم ہرگز قبول نہیں کرے گی۔ جنرل ایوب، جنرل یحییٰ، ذوالفقار علی بھٹو، جنرل ضیاء الحق اور نواز شریف جس نے بھی اپنے اپنے انداز میں شخصی حکومت اور آمریت (خواہ سول ہو یا خاکی، منتخب ہو یا غیر منتخب) کا راستہ اختیار کیا، اس نے ملک وقوم کو نقصان پہنچایا اور وہ خود بھی ناکام و نامراد رہا۔ عقل مند وہ ہے جو دوسروں سے عبرت پکڑے اور وہ غلطیاں نہ دہرائے جو دوسروں نے کیں اور جو قوم کے لیے خرابی اور خود ان کے لیے نامرادی کا باعث بنیں۔

فوج کا کردار

مجوزہ آئینی ترامیم کا تیسرا بڑا اہم پہلو سیاست میں فوج کو مستقل طور پر ملوث کر دینا ہے۔ گویا اس کا ایک مستقل کردار وضع کرنے کی کوشش ہے۔ جنرل مشرف نے بہت صاف لفظوں میں اس امر کا اظہار کر دیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ "ملکی سیاست میں فوج کا غیر تحریری، غیر واضح اور غیر رسمی کردار رہا ہے، اب اسے باضابطہ کردیا گیا ہے۔ یہ مستقبل کے لیے مارشل لا کا راستہ روکنے کی تدبیر نہیں ملک کو مستقلاً مارشل کے زیر سایہ رکھنے کا منصوبہ ہے۔ اس کی شکل یہ ہے کہ جنرل پرویز کی ذات میں صدارت اور چیف آف آرمی اسٹاف کی دونوں حیثیتیں جمع کردی گئی ہیں اور ان کو کم از کم پانچ سال تک جمع رکھا جائے گا۔ جنرل پرویز نے بی بی سی کو ایک انٹرویو میں صاف لفظوں میں بتایا ہے کہ "میں یہ دونوں عہدے ساتھ ساتھ رکھوں گا"۔ اس کے ساتھ ایک مستقل ادارہ جو غیر منتخب ہے، قومی سلامتی کونسل کی شکل میں بنایا جا رہا ہے جس کا سربراہ صدر ہوگا اور جس میں تینوں افواج کے سربراہ اور جوائنٹ چیف آف اسٹاف کا سربراہ رکن ہوں گے۔ ان کے علاوہ وزیراعظم اور چاروں وزراے اعلیٰ اس میں ہوں گے اور اب تجویز ہے کہ قائد حزب اختلاف بھی اس میں ہوگا۔ اس کونسل کے سلسلے میں امریکہ کی قومی سلامتی کونسل کا حوالہ بھی دیا گیا ہے اور ماقبل کی کوششوں سے موازنہ کر کے اس کی ضرورت اور افادیت بیان کی گئی ہے۔

ہماری نگاہ میں یہ ایک نہایت خطرناک تجویز ہے جسے چند در چند مغالطوں کے ذریعے قابل قبول بنانے کی کوشش کی جارہی ہے اور ان تضادات کو بھی نظر انداز کیا جارہا ہے جو خود اس تجویز میں مضمر ہیں۔ جس وجہ سے یہ تجویز کسی بھی شکل میں ہماری نگاہ میں قابل قبول نہیں وہ یہ تصور ہے کہ طاقت کے تین مرکز ہیں: صدر، وزیراعظم اور فوج اور ان کے درمیان اشتراک اقتدار ہونا چاہیے۔ پھر اشتراک اقتدار کے لیے بھی یہ "اصول محکم" بطور بنیاد بیان کیا گیا ہے کہ وحدت اقتدار (unity of command) ضروری ہے اس کے بغیر جوتیوں میں دال بٹے گی۔ پھر اس وحدت کی ٹوپی صدر کے سر پر رکھی گئی ہے اس لیے کہ وہ چیف آف اسٹاف بھی ہے۔ کل ایسا صدر بھی ہوسکتا ہے جو چیف آف اسٹاف نہ ہو تو پھر اس وحدت اقتدار کا کیا بنے گا؟ کیا پھر وہ کش مکش شروع نہ ہوجائے گی؟ یا ہمیشہ کے لیے ضروری ہوگا کہ چیف آف اسٹاف ہی صدر بنے؟ اور کیا آیندہ کے چیف آف اسٹاف اس پر قانع ہوجائیں گے کہ وہ صرف چیف آف اسٹاف رہیں اور صدر کوئی دوسرا ہو۔ قانون کے مطابق چیف آف اسٹاف کے لیے ایک متعین مدت ہے اور فوج کی تینوں شاخوں کے سربراہوں کے لیے ایک ہی مدت ہے۔ لیکن بری فوج کے چیف آف اسٹاف کا معاملہ مختلف کردیا گیا ہے جو دوسری افواج میں بددلی پیدا کرنے کا ذریعہ ہوسکتا ہے۔ صدر کے لیے بطور چیف آف اسٹاف خود اپنی مدت ملازمت بڑھانے کا راستہ کھلا ہوا ہے جب کہ باقی سب کے لیے مدت کی تحدید ہے، بشمول وزیراعظم اور وزیراعلیٰ۔ ان تمام تضادات کی کوئی توجیہ نہیں کی گئی۔ قومی سلامتی کونسل کے جواز میں یہ بات کہی گئی ہے کہ یہ مشاورتی ادارہ ہے لیکن مشاورتی ادارہ صدر کے لیے ہے جو کم از کم دستوری طور پر، اور خود جنرل پرویز کے اعلانات کے مطابق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قوت نافذہ رکھنے والا صدر (executive president) نہیں ہے۔ حالانکہ مشورہ دینے والا ادارہ یا ایگزیکٹو سربراہ کے لیے ہوتا ہے یا ادارہ خود ایگزیکٹو ہوتا ہے۔ لیکن جس نوعیت کی کونسل یہاں بنائی جارہی ہے اس کے وظائف اور اس کے جواز کے دلائل میں کوئی نسبت نہیں۔

سب سے بنیادی اور مرکزی سوال ملک کے سیاسی نظام میں فوج کے رول کا ہے۔ جو لوگ زمینی حقائق کی بات کرتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ بھی ایک زمینی حقیقت ہے کہ فوجی حکمرانی کے چاروں ادوار میں فوج کی سیاسی میدان میں کارکردگی بھی اتنی ہی ناکام رہی ہے جتنی نام نہاد جمہوری سول حکومتوں کی۔ بلکہ ملک کی سلامتی اور وحدت کو زیادہ نقصان فوج کی حکمرانی کے ادوار میں ہوا ہے۔ یہی جدید تاریخ کا فیصلہ ہے کہ دنیا میں جہاں بھی فوجی حکومتیں قائم ہوئی ہیں وہاں فوج کی پیشہ ورانہ صلاحیت بھی تباہ ہوئی ہے اور ملک کے سیاسی اور معاشی مسائل بھی اصلاح سے محروم اور خرابیوں کی آماجگاہ بن گئے ہیں۔

فوجی حکومتوں کے لانے اور باقی رکھنے میں بیرونی طاقتوں کا بھی ہاتھ رہا ہے اور جہاں بیرونی ہاتھ نہ بھی ہو وہاں بھی فوجی حکمران اپنی تربیت، صلاحیت، مزاج، عزائم ہر اعتبار سے سیاسی قیادت فراہم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ چلی، برازیل، ارجنٹائن، گوئٹے مالے، برما، انڈونیشیا، مصر، شام، یوگنڈا، ترکی، کانگو، نائیجیریا، گھانا، یونان، غرض دنیا کے کسی بھی گوشے میں دیکھ لیا جائے سیاست میں فوج کی مداخلت ملک اور فوج دونوں کے لیے تباہ کن رہی ہے۔ بڑے محکم شواہد اور دلائل کی بنیاد پر دنیا اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ فوج کا کردار دفاع وطن ہے اور اسی میدان میں رہ کر وہ اپنی قابلیت اور صلاحیت کو برقرار رکھ سکتی ہے۔ سیاست میں آکر اس کا پیشہ ورانہ کردار مجروح ہوتا ہے اور وہ پوری قوم کی فوج نہیں رہتی۔ اس کا سیاسی کردار اسے متنازع بنا دیتا ہے اور قوم اور فوج میں کش مکش کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

فوج کی ذہنی ساخت (mindset) سول نظام کے تقاضوں سے ناآشنا اور اس کے لیے ناموزوں ہے۔ فوج جب سیاست میں داخل ہوتی ہے تو وہ یہاں بھی اسی مزاج کا مظاہرہ کرتی ہے جو فوج کے اپنے دائرے میں تو مناسب بلکہ ضروری ہے مگر عوامی اور سیاسی میدان کے لیے قطعاً ناموزوں ہے۔ اس سے تصادم بھی جنم لیتا ہے اور مسائل بھی اُلجھتے اور گھمبیر شکل اختیار کرتے ہیں جو بالآخر جبر و تشدد اور جمہوریت اور حقوق انسانی کی پامالی پر منتج ہوتے ہیں۔

ہمارے جنرل صاحب بھی وحدتِ اقتدار کی بات کرتے ہیں جو فوج کے ذہن کا فطری حصہ ہے لیکن جمہوریت نام ہے مختلف عناصر اور تصورات میں توافق اور تعاون کا۔ اختلاف ہی جمہوریت میں اتحاد کی راہیں نکالتا ہے جب کہ فوج میں اصل چیز اجتماعیت، نظم اور اطاعت ہے۔ انفرادیت جو جمہوریت کی بنیاد ہے وہ فوج

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی مطابقت (conformism) کی ضد ہے۔ یہی وہ بات ہے جو فوجی ذہن کو سیاست کے لیے غیر موزوں بنا دیتی ہے۔ جو چیز ایک نظام کی روح اور اس کی تقویت کا باعث ہے وہی دوسرے نظام کے لیے سخت ناموزوں اور فساد کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس سلسلے میں درجنوں تحقیقی کتب اور مقالات خصوصیت سے گذشتہ ۵۰ سال کے تجربات کی روشنی میں شائع ہوئے ہیں۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ جب تک فوج سول نظم کے تابع نہ ہو کوئی مستحکم جمہوری نظام وجود میں نہیں آسکتا۔ اگر فوج کو سول کنٹرول میں دے دیا جائے یا سول اور فوج کو دو مساوی مراکز اقتدار قرار دے کر ان میں اشتراک کا کوئی نظام تجویز کیا جائے تو وہ ملک اور فوج دونوں کے لیے بالآخر تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔ عقلی دلائل اور تاریخی شواہد دونوں اس حقیقت کی تائید کرتے ہیں۔

ریاست کے وجود' حکومت کی کامیابی' قومی سلامتی اور عوامی فلاح و بہبود اور بالآخر امن' خوش حالی اور ترقی کے حصول کے لیے جہاں جائز اور مبنی برحق (legitimate) اداروں اور قیادتوں کا وجود ضروری ہے' وہیں وہ قوت قاہرہ (coercive power) بھی درکار ہے جو ان مقاصد کے حصول کے لیے ناگزیر ذریعہ ہے۔ اس کے لیے پولیس (ملکی امن و امان) اور فوج (بیرونی خطرات سے تحفظ اور دفاع) ضروری ادارے ہیں اور ایک جان دار' متوازن اور مستحکم ریاست کے قیام کے لیے فوج کا وجود اور اس کی حقیقی ضرورتوں کی فراہمی ضروری ہے۔ دو چیزوں میں فرق کرنا لازم ہے--- ایک' فوج کی حقیقی ضرورتوں اور قومی سلامتی اور حکمت عملی کے بارے میں اس کے تجزیوں اور تجاویز پر غور' نیز عالمی حالات اور درپیش خطرات کے ادراک کے باب میں افہام و تفہیم۔ یہ ہر ریاست کی ضرورت ہے اور اس کا معقول انتظام ہونا چاہیے۔ دوسرے' فوج کا اختیار اور اجتماعی' خصوصیت سے' سول معاملات میں اس کا کردار ہے۔ پہلی ضرورت ہر ملک اور قوم کو بطریق احسن پوری کرنی چاہیے اور اس کے لیے مناسب ادارے ہونے چاہییں۔ اصل بحث دوسرے مسئلے کے بارے میں ہے اور اس میں صحیح راستہ ایک اور صرف ایک ہے' اور وہ یہ کہ فوج کو سول نظام کے تابع ہونا چاہیے۔ جہاں بھی فوج سول نظام کی گرفت سے باہر ہوئی ہے یا اس پر قابض یا شریک اقتدار ہوئی ہے اس سے خرابی رونما ہوئی ہے۔ مجوزہ آئینی ترامیم میں جو چیز قابل اعتراض اور سخت خطرات کی حامل ہے وہ یہی دوسری چیز ہے۔

پاکستان کے دستور نے فوج کے کردار کو صاف لفظوں میں متعین کر دیا ہے اور اس میں کوئی تبدیلی ملک اور فوج دونوں کے لیے سخت نقصان دہ ہوگی اور ایک نہ ختم ہونے والی کش مکش کو جنم دے گی جو ملک کی سلامتی کے لیے خطرہ ہے۔

دستور کی دفعہ ۲۴۳ فوج کے قیام' مرکزی حکومت کے اس پر کنٹرول' صدر مملکت کی سپریم کمانڈ اور اہم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عہدوں کے تقرر کے بارے میں ہے۔ دفعہ ۲۴۴ حلف کے سلسلے میں ہے جس میں سیاست سے مکمل احتراز کا عہد ہے۔ دفعہ ۲۴۵ سب سے اہم ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ:

> مسلح افواج وفاقی حکومت کی ہدایات کے تحت بیرونی جارحیت یا جنگ کے خطرے کے خلاف پاکستان کا دفاع کریں گی یا قانون کے تابع شہری احکام کی امداد میں جب ایسا کرنے کے لیے طلب کی جائیں، کام کریں گی۔

پھر دفعہ ۶ اس باب میں بہت واضح ہے۔ اس میں دستور کو منسوخ کرنے، منسوخ کرنے کی کوشش کرنے یا اسے غیر موثر بنانے اور کسی صورت میں اس کی تخریب کرنے یا تخریب کرنے کی کوشش کرنے کو بدترین غداری (high treason) قرار دیا گیا ہے۔

اس طرح دستور نے فوج پر سول کنٹرول کے اصول کو محکم انداز میں پاکستان کی ریاستی پالیسی کے طور پر طے کر دیا ہے اور فوج یا سول سروس سے متعلق افراد کو ملازمت ختم ہونے کے دو سال بعد عام سیاسی راستے سے سیاست میں شرکت کی اجازت دی ہے۔ اس سے ہٹ کر کسی شکل میں اس کی اجازت نہیں دی۔

انسانی تاریخ کے دو سو سالہ تجربات کا حاصل بھی یہی ہے۔ اس لیے کہ جہاں فوج کا وجود ضروری ہے اور جہاں اس کی ضرورتوں کو پورا کرنا اور اس کے تجزیے اور حالات کے جائزے سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے وہاں ریاست اور معاشرے کے معاملات طے کرنے اور خصوصیت سے جمہوری نظام کے فریم ورک میں یہ ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے جن صلاحیتوں، جن تجربات اور جن طریقوں کی ضرورت ہے وہ فوج اور اس کے نظام کار سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ فوج، قومی سلامتی کے ایک پہلو: دفاع یعنی، جنگ اور بیرونی عسکری مداخلت کے مقابلے کی تربیت پاتی ہے اور اس کے افراد کی نفسیات سے لے کر اس کے پورے نظام کار تک اصل محور صرف یہی ہدف رہتا ہے جب کہ سیاسی نظام، اور خصوصیت سے جمہوری نظام میں، قومی سلامتی کا تعلق عسکری پہلو کے ساتھ معاشی، معاشرتی، سیاسی، اخلاقی اور تہذیبی پہلوؤں سے بھی ہوتا ہے۔ سیاسی اور جمہوری نظام کے پیش نظر صرف ریاست اور حکومت ہی نہیں بلکہ پورے معاشرے اور افرادِ معاشرہ کی سلامتی اور فلاح و بہبود ہوتی ہے۔ یہ ایک بالکل دوسرا ہی تصور ہے جس کے لیے بالکل دوسری قسم کی ذہنیت، تربیت اور نظام کار درکار ہے۔

دوسری جنگ کے بعد آزادی کی تحریکوں کے نتیجے میں ڈیڑھ سو سے زیادہ نئے ملک وجود میں آئے اور ان میں مختلف سیاسی نظاموں کے تجربات ہوئے جن میں فوجی حکومتوں کے قیام اور فوج کے مستقل سیاسی کردار کی مختلف شکلوں کا تجربہ ہوا، نیز مغربی استعمار اور اشتراکی تحریک دونوں نے اس بارے میں اپنا اپنا کردار ادا کیا، اس لیے گذشتہ پچاس برسوں میں اس موضوع پر کثیر لٹریچر وجود میں آیا ہے اور بالآخر اس پر اہل علم کا اجماع سا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوگیا کہ فوج کے لیے اصل کردار فوجی ہے، سول حکمرانی کا نہیں۔ وہی فوج بہتر اور وہی معاشرہ جمہوری اور فلاحی مقاصد کو حاصل کر سکے گا جس میں فوج سول کنٹرول میں ہو۔ اس سلسلے میں ہارورڈ کے مشہور سیاسی مفکر سیموئیل ہن ٹنگٹن کی کتاب The Soldier and the State: The Theory and Practice of Civil Military Relations, Berkeley University Press, 1957 اور بی رونیلٹ کی کتاب Controlling the Sword: The Deomcratic Governance of National Security, Harvard Univeristy Press, Cambridge MA, 1990 بہت اہم ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں اور روبرٹ جوہانسن کے اس مضمون میں جس کا حوالہ پہلے دیا گیا ہے بڑی تفصیل سے ان وجوہ، دلائل اور تجربات کو بیان کیا گیا ہے جن کا حاصل فوج پر سول کنٹرول کا اصول ہے۔ ہن ٹنگٹن نے فوجی ذہن اور نفسیات کی صحیح عکاسی کی ہے اور اس نے ایک جملے میں پورے فوجی ذہن اور خود ہمارے جرنیل صاحب کے ذہن کی حقیقی عکاسی کر دی ہے۔

> اس کو جمہوریت کا مخالف بھی خیال کیا جاتا ہے اور وہ معاشرے کی تنظیم سلسلہ احکامات (chain of command) کی بنیاد پر کرنا چاہتا ہے۔ (ص ۶۰)

ہن ٹنگٹن پوری بحث کا اصولی نتیجہ اس طرح پیش کرتا ہے:

> فوجی افسران کو سیاسی طور پر غیر جانب دار رہنا چاہیے۔ (ص ۷۱)

وہ فوجی قیادت کے وظیفے کو تین نکات میں بیان کرتا ہے: ۱- سلامتی کی حقیقی ضرورتوں کا ادراک اور ان کو سیاسی قیادت کے سامنے پیش کرنا، ۲- سلامتی کے حالات اور خطرات کے بارے میں اپنے خصوصی نقطۂ نظر کے بیان کے ذریعے سیاسی قیادت کی مدد کرنا۔ ۳- جو فیصلہ سیاسی قیادت کرے، اسے نافذ کرنا۔

فوج کا کام کاروبارِ سیاست چلانا نہیں۔ مصنف کتاب کو اس نتیجے پر ختم کرتا ہے:

> فوجیوں پر جو امن کے محافظ ہیں، بڑی بھاری ذمہ داری آتی ہے۔ وہ سب سے بڑی خدمت یہ انجام دے سکتے ہیں کہ اپنے آپ سے سچے رہیں اور فوجی روایت کے مطابق خاموشی اور جرأت سے خدمت کریں۔ اگر وہ فوجی جذبے کو مجروح کرتے ہیں تو وہ سب سے پہلے اپنے آپ کو تباہ کرتے ہیں اور بالآخر اپنی قوم کو۔ اگر شہری، فوجیوں کو فوجی معیارات سے وابستہ رہنے کی اجازت دیں تو قومیں ان معیارات کو اپنانے سے خود بالآخر نجات اور سلامتی پائیں گی۔ (ص ۴۶۶)

یہ سب اس لیے کہ فوج سیاست میں آ کر ملک کی فوج نہیں رہ سکتی۔ اگر جرنیل سیاسی اقتدار حاصل کرلیں تو ان کا حشر بھی ان انقلابیوں کا سا ہوتا ہے جو نظریے کے نام پر اقتدار میں آتے ہیں اور نظریہ ہی ان کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پہلا شکار ہوتا ہے۔

جنرل اور ایڈمرل' نہ کہ پیشہ ورانہ فوجی اخلاق' فتح یاب ہو سکتے ہیں۔ سیاسی طاقت کا اثر ان کو اچھا لبرل' اچھا فاشسٹ یا اچھا کمیونسٹ بنا سکتا ہے لیکن وہ خراب پیشہ ور ہوں گے۔ پیشہ ورانہ کارکردگی اور پیشہ ورانہ ضابطے کی پابندی کے اطمینان کی جگہ' اقتدار' منصب' دولت' مقبولیت اور غیرفوجی گروہوں کی تحسین سے ملنے والا اطمینان لے لیتا ہے۔ (۹۵)

کانٹے کی بات یہ ہے کہ:

سول کنٹرول جمہوری عمل کی شناخت ہے' جب کہ فوجی کنٹرول مطلق العنان اور کلی حکومت سے پہچانا جاتا ہے۔ (ص ۸۲)

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ فوجی اور سول دائروں کا مکمل ادغام جرمنی میں نازی دور میں ہوا اور اشترا کی نظام میں بھی فوج اور پارٹی میں گہرا رشتہ تھا۔ جمہوری نظام میں فوج کو سول حکومت کے تابع رکھا جاتا ہے اور یہی چیز فوج کی پیشہ ورانہ مہارت کی ضامن ہے۔ ہن ٹنگٹن اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

معروضی طور پر دیکھا جائے تو سول کنٹرول سے فوجی پیشہ ورانہ مہارت کا معیار اعلیٰ ہو جاتا ہے۔ زیادہ درست بات یہ ہے کہ فوجی اور سول گروہوں میں سیاسی طاقت کی تقسیم سے افسران کو پیشہ ورانہ رویے اختیار کرنے میں تقویت ملتی ہے۔

روبرٹ جوہانسن انتباہ کرتا ہے:

مستحکم جمہوری معاشروں میں بھی جمہوریت کو شاید سب سے زیادہ عصری چیلنج فوجی دائرے میں درپیش ہے۔ (Prospects for Democracy' ص ۲۱۳)

معاشرے میں عسکری ذہن جس حد تک سرایت کرتا ہے مطلق العنانیت مضبوط ہوتی ہے اور جمہوریت کی بیخ کنی ہوتی ہے۔ سیاسی لحاظ سے سیاسی پارٹیوں کے درمیان مقابلے کے عمل کو جمہوریت کی پہچان سمجھا جاتا ہے۔ یہ عمل داخلی اور عسکری مسائل پر سیاسی لحاظ سے پھر نہیں ہوتا۔ (ص ۲۱۶-۲۱۷)

جوہانسن جس نتیجے پر پہنچا ہے وہ یہ ہے:

ہمیں چاہیے کہ جمہوریت کے تقاضوں کے تحت فوجی مطالبات کو محدود کریں بجائے اس کے کہ فوجی مطالبات کے تحت جمہوری تقاضوں کو محدود کریں۔ (ص ۲۳۰)

جوہانسن کے خیال میں ''قومی سلامتی'' کے جمہوری تصور کی تفہیم ضروری ہے تاکہ نظام حکومت فوجی

© rasailojaraid.com